

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

دنیا ئے اسلام کو اپنی تاریخ میں کئی عظیم ”فتنوں“ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا عظیم ”فتنہ“ یونانی فلسفہ اور ایرانی تہذیب کی وہ بلغار تھی، جس سے ایک وقت میں واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کو یہ حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی لیٹ میں آکر کہیں خدا نخواستہ اسلام کی باطنی و خارجی قلب ماہیت نہ ہو جائے۔ اتفاق سے اس وقت یونانی فلسفہ اور ایرانی تہذیب کے جو مراکز تھے، ان کی کوئی سیاسی قوت نہ تھی اور اس کے مقابلے میں مسلمان اپنے بھر پور توسیعی و ترقی کے دور میں تھے۔ چنانچہ وہ اس ”فتنہ“ پر غالب آئے۔ اور یونانی فلسفہ اور ایرانی تہذیب مغلوب ہو کر اسلامی فکر اور اسلامی کلچر میں مدغم ہو گئی اور اس نے اسلامیت کا رنگ اختیار کر لیا۔

*

دوسرا بڑا ”فتنہ“، گیارہویں صدی عیسوی میں مشرق قریب کے مسلمان ملکوں پر مسیحی صلیبیوں کے مسلسل دو سو سال تک لگا تار حملے تھے، جن سے دنیا ئے اسلام کا یہ حصہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اور وہاں کی علمی و تہذیبی اور اجتماعی و معاشی زندگی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ تیرہویں صدی میں وسط ایشیا سے تاتاریوں کا زبردست ریلہ آیا۔ اور اس نے افغانستان سے بے کمر موجودہ ترکی تک کے سارے مسلمان ملکوں کو آگ اور خون میں غرق کر دیا۔ اس سے نہ تو کتب خانے بچے نہ شہر اور آبادیاں اور نہ خدا کی مخلوق۔ اس میں شک نہیں کہ صلیبی حملوں اور تاتاری غارت گریوں سے دنیا ئے اسلام جس طرح تباہ ہوئی، اس کی اب تک تلافی نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ عالم گیر تباہی و بربادی لانے والی خونخوار طاقتیں ذہنی و تہذیبی لحاظ سے مسلمانوں کے مقابلے میں بالکل صفر تھیں۔ چنانچہ جہاں یورپ کے صلیبی حملہ آور دنیا ئے اسلام کی اعلیٰ تہذیب کے بہت سے اثرات ساتھ لے کر واپس گئے۔ وہاں تاتاریوں کا یہ ہوا کہ ”پاسیان مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے“

*

لیکن پچھلے ڈیڑھ سو سال سے دنیا ئے اسلام جس ”فتنہ“ سے دوچار ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ اسے اپنی پوری تاریخ میں ایسے عظیم اور ہمہ گیر فتنے سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ یہ ”فتنہ“، سیاسی بھی ہے معاشی بھی۔ علمی و فکری بھی ہے اور تہذیبی و تمدنی بھی۔ غرض مسلمانوں

کی انفرادی و اجتماعی اور داخلی و خارجی زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا شعبہ بھی ایسا نہیں، جو اس کی زد میں نہ آیا ہو۔ اور اس میں اس نے غیر معمولی اختلال و ہيجان نہ پیدا کیا ہو۔ اس ”فتنہ“ نے جب دنیائے اسلام کا رخ کیا، تو اس کی پشت پر زبردست فوجی قوت اور انتہائی مؤثر اور فعال سیاسی نظام تھا۔ پھر اس وقت وہ جن علوم و فنون اور تہذیبی تصورات اور اصول کار کے ساتھ ادھر آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیائے اسلام کے پاس بحیثیت مجموعی ان کے توڑ کا کوئی سامان نہ تھا۔ یہ ”فتنہ“ اپنی تمام غارت گرانہ ہوسناکیوں اور اپنے کل شیطانی ہتکنڈوں کے باوجود تاریخ انسانی کے قدرتی ارتقاء کے اس دور کی چیز تھی، جو اپنی داخلی صلاحیتوں کی بنا پر ترقی پذیر، وسعت خواہ اور آگے بڑھنے والا تھا۔ اس کے برعکس مسلمان ملک ایک انتشار پذیر اور جان بلب جاگیر دارانہ دور سے گزر رہے تھے۔ ظاہر ہے طرفین میں تصادم ناگزیر تھا۔ اور جب وہ ہوا تو دنیائے اسلام کی تمام چولیں اس سے هل گئیں۔ اور اس کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ سیاسی و معاشی بھی۔ تہذیبی و تمدنی بھی اور ذہنی و روحانی بھی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یورپ کا یہ سیلاب مسلمان ملکوں کو بالکل اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔

*

خدا نے کیا، دنیائے اسلام سے اس ”فتنہ“ کا سیاسی تغلب تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اور اس کے معاشی تغلب سے اجابت پانے کے لئے اب ہر مسلمان ملک میں بڑے زور شور سے جدوجہد ہو رہی ہے، اور نو آزاد مسلمان ملکوں کی پوری توجہ ادھر ہی مبذول ہے۔ یہ تو زندگی کے خارجی مظاہر ہوئے جہاں تک مسلمانوں کی وسیع تر داخلی زندگی کا تعلق ہے۔ روح مسلمان میں آج جو ہم زبردست اضطراب پاتے ہیں، وہ دراصل اسی ”فتنہ“ کے معوی و باطنی تغلب کے خلاف مسلمانوں کی کشمکش کا نتیجہ ہے، جو پوری قوت کے ساتھ ہر مسلمان ملک میں ہو رہی ہے، اور جیسے جیسے مسلمان ملک سیاسی و معاشی لحاظ سے مضبوط ہوں گے، ان کی یہ کشمکش زیادہ شدید، زیادہ گہری اور زیادہ وسیع ہوگی۔ یہ اسلامی معاشرے کے انتشار و انحلال کی علامت نہیں بلکہ یہ یورپی تہذیب کی معنوی سیادت پر اس کے غائب آنے کی کوشش ہے۔ محکوم و مغلوب اسلام اب اس محکومیت و مغلوبیت سے لکھنا چاہتا ہے۔ اور اس کا واحد راستہ تشکیل نو کا ہے، خارجی بھی اور داخلی بھی۔

*

تاریخ اسلام کے ہر دور میں بڑے بڑے مجدد اور مصلح ہوئے ہیں اور اپنے اپنے زمانے میں جن چھوٹے بڑے فتنوں سے انہیں سابقہ پڑا، یقیناً وہ ان سے عہدہ برا ہوئے اور اپنے ماحول اور صلاحیتوں کے مطابق انہوں نے امت کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ یہ عظیم ”فتنہ“ جس سے ہم دوچار ہیں،

اس کے مقابلے کے لئے جو کوششیں ہو چکی ہیں ان کی ایک لمبی تاریخ ہے اور کوئی مسلمان ملک ایسا نہیں ، جہاں کسی نہ کسی شکل میں یورپ کے سیاسی تسلط اور تہذیبی برتری کے خلاف جدوجہد نہ کی گئی ہو۔ یہاں ہمارے پیش نظر ان سب کا احصاء نہیں ، بلکہ ہم ان کوششوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ، جو آج روح مسلمان میں پیدا شدہ ہمہ گیر اضطراب سے تعلق رکھتی ہیں ، اور جن کے پیش نظر مسلمانوں کی داخلی زندگی کی تشکیل ہو۔

ایک مذہب جس کی چودہ سو سال کی ہنگامہ خیز اور واقعات و حوادث سے بھری ہوئی تاریخ ہو ، اس میں مختلف مذہبی فرقوں کا پیدا ہو جانا چندان تعجب کی بات نہیں ۔ اور ایک مذہب جس کے ماننے والے کروڑوں کی تعداد میں اتنے کثیر التعداد اور دور دراز ملکوں میں ہوں ، ان کا مختلف قومیتوں میں بٹا ہونا اور ان سب کی ایک سیاسی و انتظامی وحدت نہ ہونا ہمیں زیادہ کھٹکتا نہیں چاہئے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بے شک ہر مسلمان مذہبی فرقے کا اپنا مقام اور ہر مسلمان ملک کا اپنا مستقل سیاسی وجود ہے اور اس کی کلیتہً نفی لاممکن ہے اور نہ قرین مصلحت ۔ کیونکہ یہ کثرت تاریخ اور جغرافیہ کی پیداوار ہے اور تاریخی اور جغرافیائی عوامل اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں ، جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن آج اگر مسلمان بحیثیت مجموعی بین الاقوامی زندگی میں وقار چاہتے ہیں ، اور ان کی خواہش ہے کہ دوسری قومیں ان کی بات توجہ سے سنیں ، تو ان کو لامحالہ ایک دوسرے سے قریب آنا ہوگا ۔ اور باہمی تعاون کے لئے زیادہ سے زیادہ راہیں نکالنا ہوں گی ۔ آپس کے اتحاد و تعاون کے بغیر آج کی دنیا میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی ۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی مذہبی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کے دوائر کار بھی معین و محدود کرنے ہوں گے ۔ بہتر یہ ہے کہ ان کا زور زیادہ تر ہر فرقے کے عام اصلاحی اور تعمیری پہلوؤں پر رہے۔ اور فرقہ وارانہ تنظیم اگر ہو بھی ، تو صرف معاشرتی فلاح و بہبود کی حدود تک ۔ عقائد کے بارے میں حتیٰ الوسع پہلے کی طرح کی مناظرانہ و مجادلانہ بحثوں سے احتراز کیا جائے۔ اور مختلف مذہبی فرقوں کے بارے میں یہ تصور عام کیا جائے کہ یہ ایک ہی شجرِ ملت کی مختلف شاخیں ہیں ۔ شاخیں ہونے کی حیثیت سے الگ الگ ، لیکن سب کی جڑیں اور تنہا ایک ہے ۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ایک فرقے کو کل اسلام کا قائم مقام سمجھا جائے ۔ اور اس بنا پر ہر فرقہ دوسرے سے دست و گریباں ہو ، اور اس طرح مسلمانوں میں عناد بڑھے ۔ جزو کو کل سمجھنے اور کل کو جزو

کی سطح پر لانے کا پرانا چلن اب ختم ہونا چاہئے - اور یہ جتنا جلد ختم ہو، خود فرقوں کے افراد کے حق میں اچھا ہوگا۔ اجتماعیت اس دور کا تقاضا ہے اور دین اسلام کی تو سب سے بڑی خصوصیت ہی یہی ہے۔

آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے سید جمال الدین افغانی رح نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اسی کی دعوت دی تھی - وہ مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کے داعی ہوئے کے ساتھ ساتھ انہیں دینی اعتبار سے بھی باہم متحد کرنے کے داعی تھے - انہوں نے قرآن مجید اور سنت متواترہ کو اسی دینی اتحاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا - وہ فرماتے ہیں :- قرآن مجید رشد و ہدایت کا مصدر اور اساس ہے اور اس کی تفسیر و تشریح کے ضمن میں جو کچھ ہوں ذخیرہ ہے - اس کی حیثیت وحی کی نہیں - وہ اسلاف کرام کی آراء ہیں ، آپ ان کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد آتی ہے سنت متواترہ - ”سنت متواترہ کی تشریح سید جمال الدین افغانی یوں کرتے ہیں :- ”فالتواتر، والاجماع واعمال النبی المتواترة الى اليوم هي السنة الصحيحة التي تدخل في مفهوم القرآن والدعوة الى القرآن وحده“ (مجموعه العروة الوثقى)

سید جمال الدین افغانی رح کے بعد ان کی اتحاد دہنی کی یہ دعوت گو زیادہ عام نہ ہو سکی ، لیکن تمام مسلمان ملکوں میں اس خیال کے حاسی اصحاب علم و فکر ایک ایک دو دو ضرور پیدا ہوتے رہے اور اسی طرح یہ سلسلہ دعوت آگے بڑھنا چلا گیا - اب اس دعوت کے عام ہونے کے لئے دنیائے اسلام کے حالات بڑے سازگار ہیں ، اور خود مسلمانوں کی اپنی ضرورتیں اور اس کے ساتھ ساتھ زمانے کے تقاضے انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ سید جمال الدین افغانی نے عہد حاضر میں جو راہ دکھائی تھی - اس پر وہ چائنے کی کوشش کریں ہمیں یہ حقیقت واقعی ، ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ تعمیر و تشکیل کی راہ اتحاد و اتفاق سے نکلتی ہے - تفرقہ و عناد بے عملی و انتشار کی طرف لے جاتا ہے یہ قانون قدرت ہے اور اس سے مفر نہیں

قرآن مجید اور سنت - قرآن مجید ان معنوں میں جن کی طرف سید جمال الدین افغانی نے ارشاد فرمایا اور سنت اس اعتبار سے کہ اس میں تواتر اور اجماع دونوں شامل ہوں ”فکرو نظر“ میں اس کو ”سنت جاریہ“ کا نام دیا گیا ہے ہمارے نزدیک یہ دو اساس لہ صرف تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب کر سکتے ہیں اور ان کی فرقہ وارانہ علیحدگی پسندی ختم ہو سکتی ہے بلکہ یہ ان کی معنوی و داخلی تشکیل نو کا بھی نقطہ آغاز ہو سکتے ہیں اور روح مسلمان میں آج جو اضطراب ہے اسے ان کی مدد سے دور کیا جا سکتا ہے ۔